Volume 02, Issue 03,
October-December 2024
PP: 08-15
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN
Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

ڈاکٹر اسلم انصاری کے مکتوبات میں ادبی لسانی مباحث

Literary and Linguistic Discussions in the Letters of Dr. Aslam Ansārī

Dr. Dabir Abbas [1]

Article History

Received
19-10-2024

Accepted
28-10-2024

Published
09-11-2024

Abstract & Indexing

Abstract

Dr. Aslam Ansārī is a prominent contemporary Urdu poet. He has not only demonstrated creative excellence in Urdu, but he has also composed distinguished poetry in Persian, English, and Saraiki. Besides being a poet, he is also recognized as an important Iqbal-shinās or scholar of Iqbal's works. There is considerable diversity in Aslam Ansārī's fields of study. It may be said that these dimensions are vast, and his insights are profoundly deep. This is the reason he did not restrict himself to the aforementioned two aspects but also made serious efforts in other academic and literary domains, presenting himself in various roles. He is not only a poet and Iqbal-shinās but also a critic, translator, letter writer, personality writer, fiction writer, and novelist. Dr. Aslam Ansārī holds a unique place as a letter writer. His corpus includes not only private and personal correspondence but also a substantial number of academic and literary letters. These letters are often written in response to various scholars, editors of journals, and at times to students. The topics discussed in these letters are multifaceted. In this article, we analyze the literary and linguistic discussions found in the letters of Dr. Aslam Ansārī.

Keywords

Aslam Ansārī, Literary Criticism, Maktūb Nigārī, Linguistic Discussions, Contemporary Urdu Literature.

[1] ***Assistant Professor, Government Associate College Miani, Sargodha.***
dabirshah@gmail.com

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

OPEN ACCESS

تمہید

ادیب یا شاعر کی کوئی تخلیق اُس کی شخصیت کا محض ایک عکس ہوتی ہے، مکمل نقش نہیں۔ شخصیت لمحہ بہ لمحہ تکمیل کی جانب قدم بڑھاتی رہتی ہے اور یوں تخلیقات اُس بڑھتے قدم کی مختلف تصویریں ہوتی ہیں۔ اِس لیے بنیادی اور اہم شے شخصیت ہے نہ کہ تخلیق۔ شخصیت ایک کتاب ہے اور تخلیقات اس کے مختلف اقتباسات۔ تخلیقات تو سنگِ میل ہیں کہ شخصیت بتدریج کتنا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچی ہے۔ کیوں کہ اِس کے بغیر شخصیت کا اظہار ادب میں ممکن نہیں۔ یعنی تخلیقات شخصیت کی ترسیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ کوئی بھی تخلیق شخصیت کے کسی ایک زاویہ کا عکس ہو سکتی ہے۔ کسی ایک تخلیق کو خواہ وہ کتنی ہی کامیاب کیوں نہ دکھائی دے، شخصیت کا مکمل نقش کہہ دینا درست نہیں۔

شخصیت اپنی تعمیر کے ہر مرحلے میں کوئی نہ کوئی پہلو ظاہر کرتی رہتی ہے۔ اس کے ہر موڑ پر عموماً کوئی تخلیق سامنے آتی ہے، جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ فن کار اپنی شخصیت کے اظہار کے مرحلوں میں کس کشمکش سے دوچار رہا ہے۔ یہ کروٹیں کبھی متضاد پہلو کے اُبھرنے کے نقوش فراہم کرتی ہیں، کبھی ترقی پذیر گوشوں کے اور کبھی نقطۂ نظر کی تعمیر میں مختلف میلانات کا اظہار بن جاتی ہیں۔ اب یہ فن کار کی بتدریج رسائی اور بالیدگی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے مکمل اظہار پر کس طرح قابو پاتا ہے۔ شخصیت جتنی فعال، دور رس اور قیود سے آزاد ہوتی ہے، اُس کی گرفت فکری جہات کے گرد اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے اور اس وقت تک اس پر گرد نہیں پڑتی جب تک کوئی دوسری شخصیت اس سے زیادہ وسیع احاطہ پر اپنی گرفت کا اظہار نہیں کرتی۔ جب ہم اسلم انصاری کی تخلیقی شخصیت کی بات کرتے ہیں تو اُن کی گرفت انتہائی مضبوط نظر آتی ہے۔ اُن کی اوّلین شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے ہے کہ انہوں نے صرف اُردو ہی نہیں بلکہ فارسی، انگریزی اور سرائیکی زبان میں شاعری کر کے اپنے کہنہ مشق ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ اُن کی دوسری پہچان بحیثیت نقّاد بالخصوص اقبال شناس کی ہے کہ وہ اقبالیات کے موضوع پر پانچ گراں قدر تصانیف لکھ کر اقبال کے ناقدین میں ایک معتبر نام بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ لیکن انہوں نے خود کو ان دو زاویوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ دیگر علمی و ادبی جہات کی طرف بھی سنجیدگی کے ساتھ طبع آزمائی کی اور مختلف حیثیتوں سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوئے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری کی ایک مسلّمہ حیثیت مکتوب نگار کی بھی ہے۔ اُن کے نجی و ذاتی خطوط کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی خطوط کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ یہ مکتوبات گاہے گاہے مختلف علمی و ادبی شخصیات، مجلّات کے مدیران اور بعض اوقات طلباء کے استفسارات کے جوابات کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ اقبال، میر، غالب اور بیدل کی شاعری پر اُن کے مقالے، کتب اور مصاحبے بہت اہمیت کے حامل ہیں کہ جن میں انہوں نے اِن شخصیات کے کلام کی نہ صرف تشریحات و توضیحات کی ہیں بلکہ کئی لسانی اور تحقیقی و تنقیدی مباحث بھی اُٹھائے ہیں۔ یہ نظریات مکاتیب میں مزید واضح صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان خطوط کے مباحث کثیر الجہات ہیں۔

اِن خطوط میں پیش کردہ معلومات بعض حوالوں سے بہت اہم ہیں۔ مثال کے طور پر جرمن اقبال شناس این۔ میری شمل سے پہلی اور آخری براہِ راست ملاقات کا ذکر اپنے ایک خط میں نہایت دلکش پیرائے میں کیا۔ یہ خط شاہد علی خان (مدیر "الحمرا") کے نام لکھا گیا۔ اس خط میں این۔ میری شمل سے ملاقات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> جرمن اقبال شناس اور مستشرق سے میری بس ایک براہِ راست ملاقات ہوئی، جس میں اُن کی خدمت میں میں نے اپنی فارسی مثنوی "چراغِ لالہ وای بشرای ستارہ غم ناک" پیش کر کے اُن سے پیش لفظ یا دیباچہ لکھنے کی درخواست کی تھی، جسے انہوں نے شرفِ پذیرائی بخشا اور ایک مختصر دیباچہ لکھ دیا۔[1]

اسلم انصاری کے ان خطوط میں اہم علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ جُڑی یادداشتوں کا تذکرہ نئے پہلوؤں اور حوالوں کے ساتھ ہوا ہے۔ کہیں یہ تذکرہ مفصل تو کہیں مختصر ہوا ہے۔ اس تذکرے سے ایسی شخصیات کے بارے میں مفید معلومات مل جاتی ہیں۔ ایک خط میں ڈاکٹر رانا نصر اللہ خان

سے پہلی ملاقات اور اُن کے حلیہ و شخصیت کا مفصل حال درج کر دیا۔ اس تفصیل میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر رانا صاحب کی زندگی کے ایک ایسے گوشے کی طرف بھی اشارہ کیا کہ جو اس خط سے پہلے مخفی تھا یا پھر عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ڈاکٹر رانا صاحب چار پانچ سال پروفیسر جابر علی سید صاحب کے کولیگ رہے تھے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کہتے ہیں کہ مجھے جابر علی سید صاحب نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رانا صاحب دست شناس بھی تھے نیز اُن کے نام میں لفظ "جوگی" کا اضافہ بھی تھا۔ یعنی یہ لفظ اُن کے آفیشل نام کا حصہ تھا۔ مزید بر آں ڈاکٹر رانا صاحب کیمبرج یونی ورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں یونی ورسٹی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر جوگی کی صورت بیٹھتے اور فیس وصول کر کے لوگوں کے ہاتھ دیکھا کرتے تھے۔ اس خط میں وہ ڈاکٹر رانا صاحب کے بارے میں یہ سب کچھ لکھتے ہوئے، دست شناسی کو ایک عیب کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ اُن کے نزدیک پامسٹری با قاعدہ ایک علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ہمارے ہاں دست شناسی کو "فراست الید" کا نام دیا جاتا تھا اور یہ علم بھی جملہ قیافہ شناسی کے علوم میں شمار ہوتا ہے اور قیافہ شناسی پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے حصولِ علم و دانش اور تکمیلِ علوم کے لیے ڈاکٹر رانا صاحب کے بے پایاں جذبے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ [2]

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے سید وقار عظیم کے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون "الحمرا" میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی ستائش کی خاطر ڈاکٹر اسلم انصاری نے "الحمرا" کے مدیر جناب شاہد علی خان کے نام ایک خط لکھا۔ ستائش کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر اسلم انصاری ،سید صاحب کے پسندیدہ شاگردوں میں سے ہیں۔ اس خط میں وقار عظیم کے بارے میں اپنے خیالات کا عقیدت کے ساتھ یوں اظہار کرتے ہیں کہ سید موصوف کی شخصیت کے ایک دو پہلو اُبھر کر سامنے آ جاتے ہیں:

> ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا استادِ محترم سید وقار عظیم پر مضمون بہت حد تک جامع اور اثر انگیز ہے۔ میں زندگی میں صرف ایک ہی بار سمن آباد اُن کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ اتفاق سے وہ موجود نہ تھے۔ ان کے صاحب زادے سے مختصر سی ملاقات کے بعد میں واپس چلا آیا تھا۔ میں نے اُن سے کبھی کوئی کتاب مستعار نہیں لی تھی۔ ان کی شفقت اور اندازِ کرم ہی میرے لیے کافی وافی تھا۔ اُن کا اندازِ تدریس اتنا قابلِ رشک حد تک دل پذیر اور اثر انگیز تھا کہ وہ مشکل سے مشکل بات کو اتنا سہل بنا کر پیش کرتے تھے کہ آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ وہ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے پر خلوص دستِ راست، ڈاکٹر عبادت بریلوی کے قریبی دوست اور رفیقِ کار اور طلباء و طالبات کے لیے ستارہ نور و اطمینان تھے۔ ان کی تحریروں میں جو پر خلوص علمیت اور دلوں کو ٹھنڈک بخشنے والی روشنی ہے، اُس سے میں آج بھی مستفید ہوتا ہوں۔ [3]

ڈاکٹر اسلم انصاری نے سید وقار عظیم کے بارے میں جو یادداشتیں اس خط میں رقم کر دی ہیں، اس سے یہ خط تاریخی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ اسی طرح اپنی ایک اور محترم شخصیت کہ جن کی بدولت اُن کا تعلیمی کیریئر ٹریک پر آیا کو یوں یاد فرماتے ہیں:

> میاں رسول بخش ایک معروف اور مقبول ہیڈ ماسٹر تھے۔ اُن کی تدریس اور نظم و ضبط مثالی تھا۔ میرا ایک پڑوسی مشتاق مجھے اُن کے پاس لے گیا اور انہیں کہا: میاں صاحب! میں ایک علامہ آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا: اچھا! آ بھئی علامے، مجھے یہ پڑھ کے سنا۔ میں نے فر فر پڑھ کے سنا دیا، خوش ہوئے۔ ایک دو جملوں کی انگریزی بنانے کو کہا۔ میں نے سیکڑوں مشقیں کی ہوئی تھیں۔ فوراً ان کا ترجمہ کر دیا[4]۔

یہ بات جہاں میاں صاحب کے اندازِ تدریس کو عیاں کرتی ہے، وہیں مستقبل کے ایک کامیاب مترجم کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ شخصیات سے جڑی یادداشتوں کا تذکرہ اُن کے زیادہ تر خطوط میں ہوا ہے۔ کہیں تفصیل کے ساتھ تو کہیں اختصار کے ساتھ۔ اس سلسلے کے

خطوط میں سب سے تفصیلی خط ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی مرحوم کی شخصیت کے بارے میں لکھا۔ پروفیسر عابدی صاحب کے بارے میں اپنی یاداشتیں مجتمع کرتے ہوئے اُن سے ایک ملاقات کا احوال یوں بیان کیا:

> ایک روز شام کو ہم پانچوں (آفتاب اصغر، عابد صدیق، خورشید رضوی، انور مسعود اور اسلم انصاری) اُن کے سمن آباد والے گھر جا دھمکے۔ اتفاق یہ ہوا کہ میں ایک الگ کرسی پر براجمان ہو گیا اور وہ چاروں دوست ایک صوفے پر باجماعت بیٹھ گئے۔ ایک اور اتفاق یہ تھا کہ میں ان دنوں نیر تخلص کرتا تھا اور دوستوں میں یہی تخلص بطور نام کے معروف اور مقبول ہو گیا تھا۔ چنانچہ تعارف کا مرحلہ شروع ہوا۔ میرا نام بتایا گیا، نیر۔ پھر آفتاب، پھر خورشید، پھر انور۔ پھر عابد صدیق سوز (اس زمانے میں ان کا یہی تخلص تھا)۔ اب ان ناموں پر ایک دفعہ پھر نظر ڈالیے۔ نیر، آفتاب، خورشید، انور، غالباً ان ناموں کی معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عابدی صاحب نے فرمایا: بھئی سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ ایسا مجمع الانوار ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ [5]

ایسے خطوط میں کئی ایک اہم شخصیات کا تذکرہ بھی مل جاتا ہے۔ جیسے اسی خط میں اپنے مذکورہ دوستوں سے متعلق کافی اشارات ملتے ہیں۔ وہیں اُن کی سوانحی اشارے بھی ایسے خطوط میں موجود ہیں۔ یہ اشارات ان خطوط کے علاوہ ان کے کالموں، انٹرویوز اور شخصی عکسوں کے مجموعے "مکالمات" میں بھی ملتے ہیں۔ جہاں کہیں شخصیات کا تذکرہ ہے، وہیں سوانحی اشارے بھی موجود ہیں۔

> اسلم انصاری ایک محتاط ادیب ہیں۔ انہیں گہرا صدمہ پہنچتا ہے، اگر کوئی اُن کے حوالے سے بے بنیاد بات کی تشہیر کر دے۔ وہ اپنے خطوط میں ایسی باتوں کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں اختلافات کا پہلو بھی برتنا پڑے تو بھی اُن کی رائے عالی ظرف اور بااخلاق ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مدیر "الحمرا" کے نام لکھے ایک خط میں رؤف خیر کے اس بیان کے بارے میں کہ ڈاکٹر اسلم انصاری نے مالک رام کے "تذکرۂ ماہ و سال" کو لکھنے میں بے شمار غلطیاں کی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "عرض ہے کہ اس میں جنابِ رؤف کو تسامح ہوا ہے۔ یہ مضمون کسی اور کا ہوگا، میں نے ایسا کوئی مضمون نہیں لکھا تھا"۔ [6]

نجی و ذاتی خطوط سے قطع نظر علمی و ادبی نوعیت کے خطوط کی بات کی جائے تو یہ خطوط ادیب کی تصانیف بالخصوص تنقیدی کتب میں پیش کیے گئے نظریات کو سمجھنے میں بہت مددگار ہیں۔ اُن کے ایسے خطوط کو اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان میں ایک مسلسل ارتقاء کی کیفیت موجود ہے جو یقیناً اُن کے وسیع مطالعے کا حاصل ہے۔ اقبال اور اقبال کے تصورات ڈاکٹر اسلم انصاری کے مطالعے کا خاص حصہ ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر متعدد تصانیف رقم کی ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ بھی کئی تنقیدی و تحقیقی مضامین اِس موضوع پر لکھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے چند خطوط بھی ایسے ہیں جن میں اقبال کے مختلف نظریات کی تشریحات و توضیحات ملتی ہیں۔

اقبال شناسی کے علاوہ بیدل شناسی میں بھی اسلم انصاری کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ اُن کی مختلف کتابوں میں بیدل پر مبنی کافی تعداد میں مضامین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اسلم انصاری نے اپنے مختلف مکاتیب میں بھی بیدل کے افکار کی وضاحت کی ہے۔ جامع مسجد نشتر کالج ملتان کے خطیب مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی نے ایک رقعے کے ذریعے بیدل کے ایک شعر کے معانی دریافت کیے، جو اسلم انصاری نے تفصیل کے ساتھ لکھ بھیجے۔ یہ خط اسلم انصاری کی کتاب "مکالمات" میں "مرزا بیدل کا ایک شعر، ایک غزل" کے عنوان سے شامل ہے۔ ڈاکٹر شوکت محمود نے اسلم انصاری کے وہ مضامین جو بیدل کی شخصیت اور فن سے متعلق ہیں، کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا ہے۔ اس کتاب کا نام بیدل کی اپنی ہی ایک ترکیب پر "مینا خانۂ حیرت" رکھا گیا۔ ڈاکٹر شوکت محمود کے نام اُن کا ایک خط بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط میں سے اقتباس دیکھیے:

مدت ہوئی خواجہ عباداللہ اختر کی کتاب "بیدل" میں قطعات کے باب میں بیدل کا ایک قطع نظر سے گزرا تھا، جو دل و دماغ پر نقش ہو گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اب سے چند سال قبل پڑوسی ملک کے ایک ممتاز اقبال شناس اور منفرد طرز کے شاعر جگن ناتھ آزاد نے اس قطعے کا منظوم ترجمہ کیا اور بیدل کا حوالہ دیئے بغیر اسے اپنے کلام کے طور پر پیش کیا۔ اُن کا یہ ترجمہ ماہ نامہ "الحمرا" لاہور کی کسی اشاعت میں شامل ہوا تھا۔ [7]

اسلم انصاری کہتے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ میں بر وقت اس دیدہ دلیری کی نشان دہی نہ کر سکا اور بات پرانی ہو گئی۔ آگے خط میں انہوں نے وہ قطعہ لکھ کر یہ بھی لکھا ہے "انہوں نے اس بے مثال قطعے کے دو مصرعے اپنی ایک فارسی نظم (یا قطعہ) میں تضمین کیے ہیں"۔ [8]

اس خط سے انصاری صاحب کی لطافت اور باریک بینی کا اندازہ خوب ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع کو سرسری طور پر نہیں لیتے، بلکہ اُس پر کڑی تنقیدی و تحقیقی نظر رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ اپنی شاعری میں تضمین بارے بھی اشارہ کر دیا ہے۔ بیدل کے اشعار پر مبنی تضمینات اُن کی مثنوی "نگارِ خاطر" اور نظم "تکرارِ تمنا" میں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے بیدل اور غالب کی زمین میں متعدد اشعار بھی کہے ہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے ایک سچے ادیب کی حیثیت سے اردو ادب پر بہت عمدہ تحریریں پیش کی ہیں۔ اردو زبان کے خالص لسانی مباحث بھی اُن کے مکتوبات میں مل جاتے ہیں۔ ان مباحث کی مفصل صورت اُن کی تنقیدی کتب اور دیباچوں میں ملتی ہے۔ زبان کا معاشرت اور طرزِ معاشرت سے گہرا تعلق ہے۔ زبان ہی ہے جس سے انسان اور معاشرے کا تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ "مکالمہ" کے مدیر مرزا مبین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> زبان انسان کو کائنات کے ساتھ مربوط بھی کرتی ہے اور اسے ممیز بھی۔ یہ زبان ہی ہے جس کے ذریعے انسان کائنات کے ساتھ اپنے رابطے کو بامعنی اور پائیدار بناتا ہے۔ زبان کی بدولت اشیاء اور واقعات، تصورات اور مفاہیم میں تبدیل ہو کر انسانی شعور کا حصہ بن جاتے ہیں اور پھر زبان ہی کے ذریعے پوری انسانیت کو اشیاء اور جانداروں کی بے حرفی آوازوں کی دنیا میں لفظ اور زبان کے ذریعے ممتاز و ممیز کرتی ہے۔ [9]

اس حوالے سے تفصیلات اسلم انصاری کے مضمون "زبان کی ماہیت اور تعلیم کے عمل میں اس کی معنویت" میں ملتی ہیں۔ اس مضمون پر نظر کی جائے تو زبان اور تعلیم کے تعلق پر متنوع جہات کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اسلم انصاری نے صرف زبان کے خالص لسانی مباحث پر ہی بحث نہیں کی بلکہ زبانوں کی معاشرتی حیثیت اور لفظ و معنی کے احترام و تقدس پر بھی وقیع رائے دی ہے۔ اسی خط میں مزید لکھتے ہیں:

> اس وقت زبان (اور زبانوں) سے وابستہ معنویتوں کو استحکام بخشنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے متعین دلالتیں (اور صراحتیں) معاشرے میں استحکام کا باعث ہوں۔ ہو سکتا ہے لفظ و معنی کا احترام معاشرے میں انسانوں کے ظاہر و باطن کے احترام کا باعث بھی بن جائے (لیکن اس سے زبان کی وسعتوں اور نئی معنوی پرتوں کی تلاش کی نفی مقصود نہیں) [10]

الفاظ اور معنی کی مطابقت ایک اہم بحث ہے۔ اردو میں علم معانی، بیان و بدیع کے مباحث میں ہمیشہ اسے اہم مقام حاصل رہا ہے۔ جدید لسانی علوم میں بھی اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ معنی وہ چیز ہے جس کے بغیر ہمارا ہر سماجی ابلاغ سوائے چیخ و پکار کے کچھ نہیں رہتا۔ عصرِ حاضر میں زبان کے درست استعمال کے بارے میں جو بے اعتنائی اور بے نیازی برتی جا رہی ہے، اس سے کوئی اہلِ علم ناواقف نہیں۔ اہلِ علم و ادب کی ذمہ داری ہے کہ وہ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور و فکر کریں اور اس کی کسی بہتر صورت کی تلاش میں اپنا کردار ادا کریں۔ ڈاکٹر صاحب اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ صرف اس بات پر دکھ کا ہی اظہار نہیں کرتے بلکہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اس مسئلہ پر متعدد بار قلم اُٹھا چکے ہیں۔ پروفیسر غازی علم الدین صاحب کے نام اُن کا ایک طویل خط اس موضوع پر ملتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ

زبان کوئی بھی ہو، وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے لیکن چوں کہ یہ تبدیلی اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ بوقتِ وقوع اس کا پتا نہیں چلتا لیکن جب تبدیلی محسوس حد تک وقوع پذیر ہو چکی ہوتی ہے تو ماہرینِ زبان اس تبدیلی کو علمی اصطلاحات میں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

زبان کے درست استعمال میں بے نیازی زیادہ حد تک اخباری زبان میں دیکھنے میں آئی ہے۔ اخبارات نہ صرف معلومات کا ذریعہ ہوتے ہیں بلکہ کسی زبان کی ترقی و تنزلی میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اخبارات میں زبان کے اس استعمال کو اپنے ایک خط میں یوں بیان کرتے ہیں:

> اگر آپ 1947ء سے لے کر 1950ء کی دہائی کے سالوں تک کے لاہور سے شائع ہونے والے بڑے اخبارات کی فائل اُٹھا کر دیکھیں تو آپ کو اس زمانے کی اخباری اردو میں اور آج کی اخباری اردو میں اچھا خاصا فرق نظر آئے گا، یہی حالت شاعری، افسانے اور ناول کی زبان کی بھی ہے۔ لیکن سب سے بڑا فرق یہ ملے گا کہ اس زمانے کی اردو میں زبان و بیان کے قواعد کی پابندی نظر آئے گی جو آج کی اخباری اور میڈیا کی اردو میں بہت حد تک مفقود ہوتی جارہی ہے۔ [11]

ڈاکٹر اسلم انصاری نے جہاں اپنے مکاتیب میں اخباری اردو کو موضوع بنایا ہے، وہیں کالم نگاروں کی اردو اور مختلف ٹی وی چینلز پر بولی جانے والی زبان کے انحطاط پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ زبان و بیان کے قواعد کی پابندی کے ساتھ ساتھ رموزِ اوقاف کا درست استعمال نہ ہونا بھی اخباری اور صحافتی زبان کے زوال کا سبب بنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "رموزِ اوقاف کے بغیر کوئی عبارت ایسے ہوتی ہے کہ جیسے کوئی مقرر اسٹیج پر گونگے اشارے کر رہا ہو" صرف خیالات کا اظہار کر دینا آسان امر ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلم انصاری ان خیالات کے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر جہات کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ رموزِ اوقاف کے حوالے سے مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رموزِ اوقاف کی بعض مشکلات ایسی ہیں کہ جن پر انگریز زبان دان بھی سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ نقلِ قول کے لیے واوین کے استعمال کا مسئلہ ہے۔ لکھتے ہیں:

> واوین کو انگریزی زبان دان جی ایچ والن (G.H. Walin) نے سب سے زیادہ تکلیف دہ قرار دیا ہے۔ اصل مشکل اُس وقت پیش آتی ہے جب نقلِ قول میں ایک اور نقلِ قول بھی شامل ہو اور دونوں ایک ہی وقت میں ختم ہو رہے ہوں، تو واوین کس طرح استعمال کیا جائے۔ [12]

لیکن شاعری کی طرح اسلم انصاری نثر میں بھی اپنی بات کا اختتام رجائیت پر ہی کرتے ہیں۔ زبان کے حوالے سے وہ دکھی ضرور ہیں لیکن ساتھ ساتھ وہ اردو کے مقام و مرتبے اور مستقبل میں اس زبان کے روشن امکانات کی طرف بھی نشان دہی کرتے ہیں:

> عمومی رابطے کی زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کی حیثیت مسلّم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مراعات یافتہ طبقات اب یہی مقام انگریزی کو دے چکے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ معیاری اور درست زبان بولنا ہر پڑھے لکھے اور باشعور پاکستانی کا مطمع نظر معلوم ہوتا ہے۔ [13]

اسلم انصاری کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں تعلیم و شعور بڑھتا جا رہا ہے اور لوگ معیاری زبان بولنے کو پسند کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ معیاری زبان کسے سمجھتے ہیں، ادیبوں کی زبان، صحافتی زبان یا روزمرہ کی زبان کو۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسلم انصاری کا ایک واضح مؤقف ہے کہ "معیاری زبان ہے کون سی؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں، پھر بھی جواب یہ ہے جو گرامر کے قواعد کی رو سے درست ہو اور تلفظ کے اعتبار سے قابلِ قبول تلفظ (received pronunciation) کی حامل ہو یعنی ایک اوسط درجے کے معقول آدمی کے لیے قابلِ فہم ہو۔ [14]

ڈاکٹر اسلم انصاری نے باقاعدہ لسانی نظریات پر کچھ نہیں لکھا لیکن پھر بھی منتشر صورت میں لسان اور لسانیات کے مباحث بہت جگہ پر بیان ہوئے ہیں۔ زبان کی ساخت اور ماہیئت، زبان اور تعلم، زبان اور معاشرت، لفظ و معنی کی بحث، صحافتی اور ادبی زبان اور اس کے علاوہ بھی زبان کے حوالے سے دیگر کئی جہتیں ہیں، جن کی طرف اشارے اُن کے مکاتیب میں ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر تحقیقِ لفظی پر ایک بحث دیکھیے:

فارسی میں لفظ سمندر کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس سے مراد وہ افسانوی کیڑا ہے جو مفروضہ کے طور پر آگ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ میں ہی زندہ رہ کر مر جاتا ہے۔ [15]

ایسے ہی ایک خط میں انہوں اردو کے دو معروف افسانوی کرداروں "بابو گوپی ناتھ" اور "لاجونتی" کے ناموں کی معنویت کو بنظرِ تحقیق دیکھ کر اُن پر ایک مستند رائے قائم کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ان دونوں کرداروں کے ناموں میں ایک معنوی رعایت موجود ہے، جس کے مطابق اُن کو افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری وہ پہلے نقاد ہیں کہ جنھوں نے ان کرداروں کے نام کی معنوی رعایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لسانیات اور ماہر لسانیات اُن کے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ لہٰذا لسانیات کے ساتھ ساتھ بعض مکاتیب میں ماہرینِ لسانیات کے متعلق بھی معلومات اور آراء مل جاتی ہیں۔ قواعد و بیان، لغت اور ماہیئت کے سوا چند خطوط میں اردو زبان کے دو مقبول ترین رسم الخط یعنی خطِ نسخ اور نستعلیق کے حوالے سے بھی مباحث شامل ہیں۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے نام ایک خط میں اردو کے رسم الخط کے بارے میں اُن کے خیالات مفصل صورت میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ جہاں تک ایران کے ذوقِ طباعت کا معاملہ ہے وہ ایک عرصے سے نسخ کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ نستعلیق صرف آرائشی عنوانات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ مہر نستعلیق میرے ذوق کی تسکین کا باعث ہوا ہے۔ اس لیے اگر کلیات کے لیے یہی خط اختیار کیا جائے تو بہتر ہو گا، اس لیے بھی کہ یہ ہمارے نستعلیق کے قریب ہے۔ [16]

درج بالا عبارت سے ڈاکٹر صاحب کی جمالیاتی حس کا بھی پتا چلتا ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے اور خطوط میں بھی ایسے جملے مل جاتے ہیں جن سے اُن کی جمال پسندی سامنے آتی ہے۔ ایسے مکاتیب کہ جن میں نفسیاتی اور جمالیاتی اعتبار سے اشارے موجود ہیں، اُن مکاتیب میں ہی ایسے اقتباسات بھی موجود ہیں جو اُن کی ناقدانہ خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اُن کے خطوط میں تہذیب و شائستگی کے باوصف بے لاگ تنقید کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔

اسلم نصاری کی مکتوب نگاری پر اگر ایک رائے قائم کی جائے تو وہ کچھ اس طرح ہو گی کہ اُن کی مکتوب نگاری کی سب سے اہم خصوصیت اختصار اور جامعیت ہے۔ اُن کے خطوں میں کہیں بھی طوالانی مباحث شامل نہیں ہیں۔ ذاتی نوعیت کے خطوط جہاں اُن کی سوانح کے بارے میں مستند معلومات کا ذریعہ ہیں، وہیں اپنی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت کے معاملات سے متعلق معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان میں کہیں وہ ادبی مشورے دیتے نظر آتے ہیں تو کہیں ان خطوط سے اسلم انصاری پر کیے گئے اور جاری تحقیقی کام سے بھی آگاہی ملتی ہے۔ اُن کے مستقبل کے علمی منصوبے بھی ان خطوط سے عیاں ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں بعض خطوط جو مختلف علمی و ادبی شخصیات کو لکھے گئے ہیں، خوب صورت یاداشتوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ یاداشتیں اُن شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں اور انصاری صاحب کے اُن سے ذاتی تعلقات پر مبنی ہیں۔

علمی و ادبی نوعیت کے خطوط میں انہوں نے بہت سے نظریات کی وضاحت کر دی ہے۔ اہم علمی و ادبی شخصیات اور مطالعات اُن کے ان مکاتیب کا حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان مکاتیب میں تحقیقِ لفظی، روز مرہ اردو زبان اور صحافتی زبان پر بھی مباحث شامل ہیں۔ موضوعات کا ایک تنوع ہے، جس نے ان مکاتیب میں ایک رنگا رنگ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان مکاتیب کا اسلوب سادہ، قابلِ فہم اور شستہ ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1 ڈاکٹر اسلم انصاری، بنام شاہد علی خان، مدیر (الحمرا)، بتاریخ 25 جنوری 2019ء، مملوکہ ڈاکٹر اسلم انصاری۔

2 ایضاً، بنام پروفیسر غازی علم الدین، بتاریخ 23 جولائی 2018ء، مشمولہ "**مشاہیر ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین**"، مرتبہ حفیظ الرحمٰن احسن، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2019ء)، ص 143۔

3 ڈاکٹر اسلم انصاری، بنام شاہد علی خان، مدیر (الحمرا)، بتاریخ 25 جنوری 2019ء، مملوکہ ڈاکٹر اسلم انصاری۔

4 ایضاً، بنام پروفیسر غازی علم الدین، بتاریخ 29 جولائی 2022ء، مملوکہ ڈاکٹر اسلم انصاری۔

5 ایضاً، بنام پروفیسر غازی علم الدین، بتاریخ 8 نومبر 2018ء، مشمولہ "**مشاہیر ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین**"، ص 147/ 148۔

6 ایضاً، بنام شاہد علی خان، مدیر (الحمرا)، بتاریخ 25 جنوری 2019ء، مملوکہ ڈاکٹر اسلم انصاری۔

7 ایضاً، بنام ڈاکٹر شوکت محمود، بتاریخ 17 اکتوبر 2018ء، مملوکہ ڈاکٹر اسلم انصاری۔

8 ایضاً

9 ایضاً، بنام مبین مرزا، مدیر (مکالمہ)، مشمولہ "**مکالمہ**"، شمارہ نمبر 42، (کراچی: اکادمی بازیافت، نومبر 2018ء)، ص 140/ 141۔

10 ایضاً

11 ایضاً، بنام پروفیسر غازی علم الدین، بتاریخ 08 جولائی 2018ء، مشمولہ "**مشاہیر ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین**"، ص 137۔

12 ایضاً، بنام پروفیسر غازی علم الدین، بتاریخ 14 جولائی 2018ء، مشمولہ "**مشاہیر ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین**"، ص 139۔

13 ایضاً، بنام پروفیسر غازی علم الدین، بتاریخ 08 جولائی 2018ء، مشمولہ "**مشاہیر ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین**"، ص 137۔

14 ایضاً

15 ایضاً، بنام ڈاکٹر شوکت محمود، بتاریخ 17 اکتوبر 2018ء، مملوکہ ڈاکٹر اسلم انصاری۔

16 ایضاً، بنام ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، بتاریخ 15 جنوری 2022ء، مملوکہ ڈاکٹر اسلم انصاری۔